آدابِ معاشرت
احادیثِ نبویہ کی روشنی میں
مقرر
مولانا مفتی محمد زاہد
سیرت النبی ﷺ چیئر
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

آدابِ معاشرت احادیثِ نبویہ کی روشنی میں

مقرر

مولانا مفتی محمد زاہد

سیرت چیئر

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

موضوع: آدابِ معاشرت احادیثِ نبویہ کی روشنی میں

مقرر: مولانا مفتی محمد زاہد

تدوین وترتیب: ڈاکٹر محمد سجاد

نگران: پروفیسر ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمان

منتظم: پروفیسر محمد رفیق طاہر

نگران طباعت: ڈاکٹر سرمد اقبال

تخریج قرآن وحدیث،

کمپوزنگ وصدابندی: ابتسام الرحمان

معاون: بشارت احمد منگلا

فارمیٹنگ وڈیزائننگ: مشتاق حسین، اقبال چیئر

ناشر: پرنٹ پروڈکشن یونٹ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

طابع: سیرت چیئر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اکڈیمک کمپلیکس، H/8 اسلام آباد

پیش لفظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سیرت چیئر کے زیر اہتمام سلسلہ وار توسیعی خطبات کا یہ خطبہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد زاہد صاحب نے انتہائی آسان پیرایہ میں یہ سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے بین السطور جو اہم نکات پوشیدہ ہوتے ہیں انہیں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

حکمت نبوت کے یہی وہ اسرار ورموز ہوتے ہیں جو ہماری زندگی کے لیے مشعل راہ ہوتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ یہ خطبہ ہمارے نوجوان محققین کے لیے تحقیق وتفحص کی نئی جہتوں کی جانب توجہ مبذول کرانے کا سبب بنے گا اور حکمت نبوت کے پہلوؤں کو مزید اجاگر کرنے کے لیے تحقیق کے دروازے کھولے گا۔

پروفیسر ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن
صدر نشین سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم چیئر

مولانا مفتی محمد زاہد

آپ کی ولادت 1964ء کو فیصل آباد میں ہوئی، آپ شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد رحمہ اللہ کے صاحبزادے ہیں

تعلیم:

آپ نے حصول علم کے لیے مختلف دینی و عصری تعلیمی اداروں سے استفادہ کیا جن میں جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد و بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد وغیرہ شامل ہیں۔

آپ کے اساتذہ میں شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد رحمہ اللہ، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا محمد قاسم (استاذِ حدیث جامعہ مدنیہ لاہور)، مولانا قاری عبد الرشیدؒ، مولانا قاری عبد الرحمن، الاستاذ الدکتور علی عشری زاید، الاستاذ الدکتور جابر قیمحہ، الاستاذ الدکتور ابراھیم الخولی وغیر شامل ہیں۔

مناصب:

آپ متعدد علمی وانتظامی مناصب پر فائز ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

- نائب مہتمم و نائب شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد
- چیئرمین شریعہ بورڈ بینک آف پنجاب

- چیئرمین شریعہ بورڈ عسکری بینک
- چیئرمین شریعہ بورڈ بینک آف خیبر
- ممبر مجلس انتظامیہ عالمی رابطہ ادب اسلامی پاکستان

تصنیف و تحقیق:

تصنیف و تحقیق کے میدان میں آپ کی کئی گراں قدر کاوشیں ہیں جن میں سے چند کتب و مقالات درج ذیل ہیں:

1۔ تکملہ معارف السنن عربی شرح جامع ترمذی

2۔ اشرف التوضیح اردو شرح مشکوۃ المصابیح جلد سوم، چہارم

3۔ اسلامی بینکاری کی بنیادیں-ایک تعارف (مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ)

4۔ .خلافت علی رضی اللہ عنہ احادیث نبویہ کی روشنی میں

5۔ تحریک پاکستان کے دینی اسباب و محرکات خلافت علی رضی اللہ عنہ احادیث نبویہ کی روشنی میں

6۔ حرمۃ المصاھرۃ بالزنا و مقدماتہ (الدراسات الاسلامیہ اسلام آباد اور البعث الاسلامی ندوۃ العلماء لکھنو میں شائع ہونے والا عربی مقالہ)

7۔ دراسۃ فی الاحادیث الواردۃ فی الطاعون (عربی مقالہ الدراسات الاسلامیہ میں شائع ہوا اور اس کا اردو ترجمہ مجلہ تحقیقاتِ حدیث میں شائع ہوا)

8۔ عدالتی تنسیخ نکاح کا شرعی حکم (فکر و نظر اسلام آباد)

9۔ اجتماعی اجتہاد کے خدوخال: دوسری صدی ہجری کے اجتہادی ماحول کے تناظر میں (مقالہ برائے سیمینار منعقدہ زیر اہتمام ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد و مشمولہ در کتاب ''اجتماعی اجتہاد'')

آداب معاشرت احادیث طیبہ کی روشنی میں

مقرر: مولانا مفتی محمد زاہد

تاریخ[1]: 10 جنوری 2023

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَصَلَّى اللهُ عَلٰى سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلَّم

نبی کریم سرورِ دو عالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے ہیں اور آپ نے اپنی بعثت کے جو مقاصد بیان کیے ہیں ان میں ایک دو چیزیں آپ نے بہت اہتمام سے بیان فرمائی ہیں، اور ان کی اہمیت کا ایک مظہر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر "انما" یعنی حصر کے لفظوں سے فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "مجھے تو بس معلم بنا کر بھیجا گیا ہے"۔[2] اور دوسرے آپ نے فرمایا کہ "مجھے تو بس اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے[3]"۔ قرآنِ کریم نے بھی جو چار مقاصدِ بعثت بیان فرمائے وہ بھی انھی دو چیزوں کے گرد گھومتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ پڑھ کر سنانا، قرآن کا علم دینا اور حکمت کی تعلیم دینا یہ تینوں چیزیں معلم ہونے کا تقاضا ہیں، اور ویزکّیھم کا تعلق تزکیۂ اخلاق کے ساتھ ہے۔

---

1 10 جنوری 2023 کو یہ خطبہ ایکسیلینس سینٹر سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم چیئر کے زیر اہتمام علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے اکیڈمک کمپلیکس میں واقع سیمینار روم میں منعقد ہوا۔

2 سنن ابن ماجہ، أبواب کتاب السنۃ، باب: فَضْلِ الْعُلَمَاءِ وَالْحَثِّ عَلٰى طَلَبِ الْعِلْمِ

3 مسند احمد، مسند المکثرین من الصحابۃ مسند أبي ھریرۃ رضي اللہ عنہ

مکارم اخلاق میں کچھ چیزیں تو وہ ہیں جن کو ہم سب بہت آسانی سے محسوس کرتے ہیں کہ یہ اخلاق کا حصہ ہیں اور ہمیں ان پر عمل بھی کرنا چاہیے، اگرچہ ہماری عملی زندگی میں کوتاہیاں موجود ہیں، لیکن یہ شعور ضرور موجود ہے کہ یہ دین کا حصہ ہیں۔ اسی کے ساتھ اخلاقیات میں متعدد چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں ہمیں بعض اوقات احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ بھی اعلیٰ اخلاق کا، میل جول کا اور ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ کا کوئی ادب ہے، سلیقہ ہے یا کوئی ملحوظ رکھنے کی چیز ہے۔

اسی طرح سرور دوعالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ میں بھی اور احادیث مبارکہ میں خاص طور پر ذخیرۂ حدیث میں اخلاقیات کے بارے میں جو ہدایات ہمیں ملتی ہیں، کچھ تو ایسی ہیں جو براہِ راست ہیں ہی اخلاقیات سے متعلق ہیں۔ آپ نے اگر کوئی گفتگو فرمائی تو اس کا موضوع ہی اخلاقیات ہے جس کو اصول فقہ کی اصطلاح میں کہتے ہیں "ماسیق الکلام لاجلہ"[4] کہ بات ہی اس چیز کو سمجھانے کے لیے کی گئی تھی۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی میں بھی بعض چیزیں ایسی ہیں جو بہت واضح طور پر اخلاقیات سے متعلق ہیں۔ لیکن محض ان چیزوں سے بعض اوقات کسی شخصیت کا پورا فہم حاصل نہیں ہوتا۔ جس طرح کسی انسان کے کلام کا ایک براہِ راست مدلول ہوتا ہے اور ایک اس کا بین السطور مدلول ہوتا ہے، اسی طرح انسان کی عملی زندگی کا بھی ایک ظاہر ہوتا ہے جو سامنے نظر آرہا ہوتا ہے اور ایک بین السطور ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کو، آپ کی شخصیت کی عظمت کو آپ کی عملی زندگی

4 اصول الشاشی، دلالات اربعہ، عبارۃ النص
نور الانوار، دلالات اربعہ، عبارۃ النص

کے بین السطور سے سمجھنا، یہ سیرت طیبہ کا ایک اہم حصہ ہے۔اس پر شاید کچھ کام ہوا بھی ہو، بہر حال یہ ایسا میدان ہے جس میں بہت کام کی گنجائش موجود ہے۔

اس طرح کا جو بھی علمی کام ہو یا سیرت کے دیگر پہلوؤں پر جتنا کام ہوا ہے یا ہو گا ان سب میں تحقیق کا ایک عنصر یہ بھی شامل ہونا چاہیے کہ سیرت مبارکہ جن اخلاق اور جن رویّوں کی طرف ہماری راہ نمائی کر رہی ہے ان کے بارے میں یہ غور کیا جائے کہ ان چیزوں پر عمل کے لیے افراد اور سماج کو کیسے تیار اور آمادہ کیا جائے، یا یوں کہہ لیجیے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ان کا نفوذ کیسے کیا جائے۔میرا اندازہ یہ ہے کہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں قائم اس سیرت چیئر اور سینٹر آف ایکسیلینس میں اس بات کو خاص طور پر مد نظر رکھا گیا ہے کہ ان ساری چیزوں کو افراد اور سوسائٹی میں رائج کرنے کی ترکیبیں بھی سوچی جائیں۔یعنی ہماری تحقیقات صرف اوراق اور کتابوں کی زینت نہ ہوں، وہ صرف ریسرچ پیپرز کی شکل میں یا کتابوں کی شکل میں نہ رہ جائیں بلکہ اس پر بھی باقاعدہ کام ہو کہ یہ ساری کی ساری باتیں جو تحقیقی پلیٹ فارمز پر کہی جاتی ہیں وہ میری، آپ کی، ہماری سوسائٹی کی، ہمارے بوڑھوں، ہمارے جوانوں، ہمارے بچوں، ہمارے مردوں، ہماری عورتوں، ہمارے صحت مند لوگوں اور ہمارے بیماروں کی زندگی میں کیسے آئیں گی؟اور ہماری سوسائٹی اس زندگی کا اور اس اخلاقی معیار کا نمونہ کیسے بنے گی؟ جس طریقے سے سرورِ دوعالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنی سیرت کا ایک نمونہ بنایا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ معیار کے اعتبار سے اللہ کے نبی ﷺ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "وَیُزَکِّیھِم" کے منصب کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوسائٹی کو اس رخ پر ڈال دیا تھا جس رخ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی عملی زندگی تھی۔

آج میں کچھ مثالیں عرض کروں گا کہ سیرت کے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے وہ واقعات جو حدیث کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں، ان کے بین السطور سے کس طریقے سے سرورِ دو عالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے مختلف پہلو اخذ کیے جا سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس سب غور و فکر کا بنیادی محور یہ ہونا چاہیے کہ یہ چیزیں میری اور آپ کی عملی زندگی میں بھی آ جائیں۔

جیسا کہ صاحبزادہ صاحب نے فرمایا کہ اللہ جل جلالہ کا اس امت پر بہت بڑا کرم اور احسان ہے کہ سرورِ دو عالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف تعلیمات نہیں، آپ کی زبانی ارشاد فرمائی ہوئی باتیں ہی نہیں بلکہ آپ کی عملی زندگی کا اور خاص طور پر نبوت ملنے کے بعد کی تئیس سالہ زندگی کا ریکارڈ انتہائی مستند طریقے سے محفوظ کرا دیا گیا ہے اور اللہ کا کرم ہے اور ہم اہلِ پاکستان کو بالخصوص اور برصغیر کے علمی حلقوں کو بالعموم اس پر فخر ہونا چاہیے کہ یہاں پر حدیث کے استناد اور حدیث کی حجیت اور حدیث کی محفوظیت پر جتنا کام ہوا ہے اس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ پورے عالم اسلام کے لیے ایک مشعل راہ ہے۔

صرف مولانا مناظر احسن گیلانی کی ہی ایک شخصیت کو اگر لے لیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ پوری عرب دنیا سمیت عالم اسلام کو اس موضوع پر انہوں نے ایک راہ دکھائی۔ چونکہ وقت مختصر ہے اس لیے موضوع کے اس اہم پہلو پر میں زیادہ تفصیل سے گفتگو کرنے سے قاصر رہوں گا۔ البتہ صرف ایک چیز کی طرف توجہ دلانا مناسب سمجھوں گا۔ آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی کے بارے میں کچھ واقعات کا حوالہ آئے گا، ان میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی سے متعلق ہیں اور جسے نقل بھی زیادہ تر امہات المؤمنین ہی کر رہی ہیں۔ ان میں بعض جگہوں پر دیکھنے میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ازواجِ مطہرات کے درمیان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تعلقات شاید نارمل نہیں ہوتے تھے۔ یا ازواجِ مطہرات کے درمیان آپس میں یعنی سوکنوں کے درمیان تعلقات معمول کے نہیں ہوتے تھے۔ اس طرح کی چیزیں ہمیں حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ اور اس طرح کی احادیث کو لے کر عموماً یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ پورا کا پورا ذخیرۂ حدیث ایک عجمی سازش ہے اور نعوذ باللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو مجروح کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا ہے۔ لیکن اگر تھوڑی سی گہرائی میں جا کر دیکھیں تو پہلی بات تو یہ ہے کہ جن چیزوں کو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ نہیں ہونی چاہییں، حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت فطری اور نارمل چیزیں ہیں اور وہ کسی بھی گھریلو زندگی کا حسن ہیں۔ اس کی تفصیل میں میں اگر جاؤں گا، اہل علم میرے سامنے موجود ہیں، تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، میرا اشارہ سمجھ گئے ہوں گے۔ اگر بات کا رخ ادھر کروں گا تو بات لمبی ہو جائے گی۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ جو اصل بات میں اس وقت حدیث کے استناد کے حوالے سے کہنا چاہتا ہوں کہ یہ احادیث اور یہ واقعات، حدیث کے استناد کی بہت بڑی دلیل ہیں کہ اس امت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ریکارڈ کو محفوظ کرتے ہوے محض عقیدت کی نظر سے آپ کی زندگی کو نہیں دیکھا بلکہ جو واقعات پیش آئے ہیں، جو چیزیں پیش آئی ہیں، جس طرح انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مشاہدہ کیا ہے حتی کہ ازواج مطہرات نے بھی، انہوں نے ہو بہو اس کو اسی طریقے سے نقل کر دیا ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سب سے زیادہ اس طرح کی احادیث کو روایت کر رہی ہیں۔ اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ان مرویات میں بعض چیزیں ایسی ملتی ہیں جن میں میاں بیوی کے درمیان بہت زیادہ بے تکلفی سمجھ میں آتی ہے۔ اور کوئی عام سا آدمی یہ محسوس کر سکتا ہے، عام آدمی تو خیر فطری انداز سے سوچتا ہے، عام آدمی کی جگہ کہہ دیجیے کہ حد سے بڑھا ہوا کوئی فلسفی یہ محسوس کر سکتا ہے۔ کیونکہ غلط فہمیاں فلسفیوں کو ہوتی ہیں عام آدمیوں کو غلط فہمیاں کم ہوتی ہیں۔ عام آدمی کا اندازِ فکر بہت فطری ہوتا ہے۔ لیکن جو بہت زیادہ عقل مند بن جاتا ہے یا بہت زیادہ فلسفی بن جاتا ہے تو دماغ کی خشکی کے نتیجے میں بعض چیزیں ایسی ذہن میں آنے لگ جاتی ہیں کہ شاید یہ نہیں ہونی چاہییں اور وہ بیوی کو بھی عام امتی کے مقام پر رکھ کر دیکھتے ہیں۔

ایک عام امتی کو اللہ کے نبی کے سامنے جس طرح ہونا چاہیے ایک بیوی کو بھی اسی طریقے سے ہونا چاہیے؟ نہیں، حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کا یہ پہلو اور اس موضوع پر آنے والی احادیث، ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی گھریلو اخلاقیات کا بہت بلند حصہ پیش کرتی ہیں۔اور دوسرے حدیث کے استناد کی بہت بڑی دلیل ہیں۔ کہ یہ چیزیں جو نقل ہوئی ہیں وہ فطری انداز سے ہوئی ہیں۔ یہ باتیں اگر نقل نہ ہوتیں تو اعتراض ہونا چاہیے تھا کہ میاں بیوی میں اور سوکن میں تو یہ باتیں ہو کر رہتی ہیں، یا تو وہ زندگی غیر فطری تھی یا نقل کرنے والوں نے کوئی ڈنڈی ماری ہے۔اور غیر فطری زندگی وہاں ہوتی ہے جہاں جبر ہو۔ بغیر جبر کے غیر فطری زندگی نہیں لائی جاسکتی۔

میں اب چند مثالیں پیش کروں گا، سب سے پہلے ہم آتے ہیں صحیح بخاری کے پہلے باب کی طرف [5] جس میں ام المؤمنین سیدۃ عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا یہ بیان فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز کیسے ہوا؟اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا کا برتاؤ اور معاملہ کیا تھا؟ اور پھر ورقۃ بن نوفل کی طرف جانا کیسے ہوا؟ یہاں پر بھی عام سیدھے سادے ذہن کو تو کوئی اشکال نہیں ہوا لیکن زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کو اشکال ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ورقۃ بن نوفل کے پاس جانا کیا معنی رکھتا ہے؟ لہذا اس حدیث کے ثبوت ہی کا انکار کر دیا جائے۔اور ایک جذباتی سا جملہ بول دیا کہ اللہ کے نبی کو بچالو اور بخاری کی قربانی دے دو۔ ایک بخاری نہیں اربوں بخاری نبی کی حرمت پر قربان کرنے کے لیے ہم تیار ہیں، لیکن اس کو اس نبی کے فرمودات کے استناد ہی کے انکار کا ذریعہ بنالیا جائے، تو اس کے لیے ہم تیار نہیں۔ خیر وہ تو ایک الگ بات ہے حدیث کے اس پہلو کی کہ ورقۃ بن نوفل کی طرف جانا

5 صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی

کیسے ہوا ؟ بادی النظر میں لگتا ہے کہ اس پورے واقعے کا اخلاق اور میاں بیوں کے درمیان اچھے نباہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی نہیں بلکہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا کی بھی بہت خوب صورت شخصیت سامنے آتی ہے۔

جس دور کا یعنی پہلی وحی سے ذرا پہلے دور کا روایت میں ذکر ہو رہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یہ ایک بہت بڑے غیر معمولی تغیر کا دور تھا، اور آپ اپنے گھر کی زندگی کو چھوڑ کر ایک غار میں زندگی گذارنے لگے ہیں۔ بظاہر ایک خاتون کو، خاتونِ خانہ کو اس پر اعتراض ہونا چاہیے۔ رات کو دیر سے گھر آنے پر میں اور آپ سب جانتے ہیں کہ کیا صورت حال ہو سکتی ہے۔ اور یہاں تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کے معمولات میں بہت بڑی تبدیلی آگئی ہے۔ لیکن وہ چونکہ ان کے ایک فطری رجحان کے تحت آرہی ہے، طبیعت میں ایک نیا رجحان ابھر رہا ہے اور لگ رہا ہے کہ اس کے نتیجے میں کچھ ہونے والا ہے، اس لیے ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا کا یہ بہت بڑا کمال ہے۔ اس میں جتنا غور کیا جائے کم ہے۔ کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس رجحان میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ وگرنہ کوئی اور خاتون ہوتی اور کوئی اور خاوند ہوتا تو وہ کہہ سکتی تھی اور ان کو کہنے کا حق تھا کہ عبادت ہی کرنی ہے، گھر کر لیں۔ عبادت ہی کرنے کے لیے جارہے ہیں تو بیت اللہ میں کر لو۔ عبادت کے لیے تو بیت اللہ زیادہ موزوں ہے۔ وہاں غار میں آپ کس لیے جاتے ہیں اور اتنا اتنا وقت گذارتے ہیں، گھر والوں کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

لیکن قربان جائیں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا کے کہ انھوں نے اس طرح کے کسی ردِّ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ کیونکہ اگر اس طرح کی بات ہوتی اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کے علم میں بھی آئی ہوتی تو وہ اسے ضرور روایت کرتیں۔ جس تفصیل سے باقی واقعہ نقل ہوا ہے اس کا تقاضا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے اس طرح کا کوئی ردِّ عمل آیا ہوتا تو ضرور نقل کیا جاتا۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم کا یہ عمل کہ ایک مرتبہ تارک الدنیا ہوگئے اور اعتکاف شروع کردیا تو پھر اعتکاف ہی کے ہو کر رہ گئے۔ ایسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا۔ بلکہ آپ غارِ حرا میں جاتے اور کچھ مناسب دن گذار کر گھر واپس آجاتے۔ اور دوبارہ گھر میں کچھ دن گذارتے۔ تاکہ گھر والوں کی خبر گیری بھی ہوتی رہے اور ان کی کسی قسم کی دل شکنی بھی نہ ہو۔ اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غار حرا سے ایک خاص کیفیت میں واپس تشریف لاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں "زملونی زملونی" (مجھے چادر اوڑھا دو)، اس موقع پر ایک عورت کی فطرت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے یہ سوال کرتی ہے کہ آپ کو ہوا کیا ہے؟ اور اصرار کے ساتھ سوال کرتی ہے۔ "اک تے تسی کوئی گل نئی دسدے"۔ اس نے صرف اس موقعے پر اعتراض نہیں کرنا، اس نے اس کی پوری زندگی پر اعتراض کرنا ہوتا ہے کہ اس وقت جو آپ سے غلطی سرزد ہورہی ہے، یہ اسی موقعے پر نہیں ہورہی بلکہ آپ کی عادت ہی یہ ہے۔ لیکن قربان جائیں ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا پر، کہ سوال کا ایک لفظ ہمیں نہیں ملتا کہ آپ کو ہوا کیا ہے؟ یہ ہے شوہر شناسی۔ ایک دوسرے کو سمجھنا۔ کیونکہ وہ اندازہ لگا رہی تھیں کہ آج کل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ارادے کے بغیر خاص کیفیات سے گذر رہے ہیں۔ تو جس کیفیت سے

گذر رہے ہیں وہ یقینا کوئی بیماری نہیں ہے ،لہذا ان کو وہاں سے گذرنے دیا جائے ،درمیان میں سوال کا روڑا اٹکانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔بس اتنا ہوا کہ "زملونی"(مجھے چادر اوڑھا دو)کا حکم آیا اور وہ حکم فوراً پورا کر دیا گیا۔

ویسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ تھی کہ باہر کے معاملات میں بھی اور اپنے ذاتی معاملات میں بھی گھر والوں کو شریک کیا کرتے تھے۔ان کو معاملات بتایا بھی کرتے تھے ،اعتماد میں بھی لیا کرتے تھے۔چنانچہ ایک [6] موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے ،بہت خوش خوش تھے۔ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کو بتایا کہ آج نیا واقعہ پیش آیا۔اور اس سے معترضین کا منہ بند ہو گیا ہے۔معاملہ یہ تھا کچھ لوگ حضرت اسامۃ بن زید اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے نسب میں شک کر رہے تھے۔شک کی کیا گنجائش ہونی تھی کہ حضرت اسامہ کی والدہ ام ایمن تھیں، جن کے کردار پر اندر سے قریش کو بھی اطمینان تھا، جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت اسامہ کی رنگت اپنے والد زید بن حارثہ سے نہیں مل رہی تو جھوٹے پراپگنڈے کا انھیں موقع مل گیا۔عربوں کا ایک بڑا قیافہ شناس اور بڑا کھوجی قبیلہ تھا بنو مدلج ،اس کے ایک شخص گذر رہے تھے اور یہ دونوں باپ بیٹا لیٹے ہوئے تھے، صرف پاؤں ننگے تھے،اس نے دونوں کے پاؤں دیکھ کر کہا کہ یہ باپ بیٹے کے پاؤں ہیں۔"ھذہ الاقدام بعضھا من بعض"۔چونکہ اس قبیلے کی مہارت کو قریش وغیرہ بھی مانتے تھے، ہجرت کے موقع پر غارِ ثور کے قریب تک رسائی بھی انھوں نے اسی قبیلے کی مدد سے حاصل کی تھی،

---

6 صحیح البخاري، کتاب الفرائض، باب القائف

اس لیے رسول اللہ ﷺ کو بنو مدلج کے اس تبصرے پر بہت خوشی ہوئی کہ اس کی بات سے مشرکین کے منہ بھی بند ہوجائیں گے۔ یہ ایک باہر کی زندگی کا معاملہ تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کو بتایا کہ آج ایک مسئلہ حل ہوگیا۔ اللہ کے نبی کے لیے تو وہ مسئلہ تھا ہی نہیں۔ اللہ کے نبی کو تو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے نسب میں ایک رتی برابر بھی شک نہیں تھا۔ لیکن اعتراض کرنے والوں کا ایک اعتراض تھا کہ رنگت نہیں مل رہی باپ بیٹے کی، وہ مسئلہ حل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آتے ہی گھر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتایا۔ لہذا یہ بھی سیرتِ مبارکہ کا ایک سبق ہے کہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ مختلف معاملات پر بات کی جائے، انھیں صرف گھر چلانے والا روبوٹ نہ سمجھا جائے۔

یہاں پر بھی ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا کو از خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟ اور اس کے بارے میں اپنا تبصرہ بھی فرمایا کہ "لقد خشیت علی نفسی"[7] (مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے)۔ اس موقعے پر حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے جو کلمات ادا کیے اور جس انداز سے ادا کیے وہ بذاتِ خود تشریح طلب ہیں، ان کی تشریح کے لیے خاصا وقت چاہیے۔ البتہ خلاصہ پوری بات کا یہ ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بہت زور دے کر کہا کہ اللہ آپ کو ناکام ہونے گا دے یہ سوچنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لیے کہ آپ کے اندر کچھ اوصاف پائے جاتے ہیں۔ یعنی یہ اوصاف جہاں پائے جائیں وہاں کامیابیاں

---

7 صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی

قدم چومتی ہیں۔ اوصاف میں حضرت خدیجہ نے یہ نہیں ذکر کیا کہ آپ اعتکاف کرتے ہیں، تنہائی میں عبادت کرتے ہیں اور ریاضت و مجاہدہ کرتے ہیں، حالانکہ یہ رسول اللہ ﷺ کے تازہ ترین اعمال تھے۔ اس کے برعکس آپ نے سات اوصاف وہ ذکر فرمائے جن کا خلقِ خدا سے تعلق ہے۔ وہ سات اوصاف یہ ہیں۔ (۱) آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، یعنی رشتوں کو جوڑتے ہیں توڑتے نہیں ہیں۔ (۲) آپ لوگوں کا مالی بوجھ اپنے ذمے لے لیتے ہیں (۳) ایک غریب شخص کو کمانے پر لگادیتے ہیں (۴) آپ مہمان نواز ہیں (۵) آپ سچ مچ کی آفات میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں (۶) آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں (۷) آپ امانت کا پاس رکھتے ہیں۔

لیکن میں بات کو تھوڑا سا آگے لے جاتا ہوں۔ ورقہ بن نوفل کے پاس جانا۔ اس کو عموما یوں دیکھا جاتا ہے کہ یہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گذر رہی ہے، گویا اس کی تشخیص کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورقہ کے پاس جارہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے گویا اس ساری صورتِ حال میں ایک تجسس کا پہلو ہے، اور آپ اس تجسس کا ازالہ چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا مطالعہ یا تو کم ہے یا استحضار نہیں ہے۔ اس کا تعلق اس چیز کے ساتھ دور دراز تک نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی شخصیت اور آپ کی شخصیت کے اہم پہلو مروت، لحاظ اور دوسرے کی رعایتِ خاطر کے ساتھ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی ضرورت نہیں تھی کہ کسی سے کچھ پوچھیں کہ میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی تشخیص کیا ہے۔ اور نہ ہی کبھی آپ کے ذہن میں کبھی اس بات کا خیال پیدا ہوا ہے کہ میں نے کسی ایکسپرٹ (ماہر) کی اوپینین (رائے) لینی ہے۔ کسی ماہر

فن کی رائے لینی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ اس سے بہت منزہ تھا اور بلند تھا۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ ورقہ بن نوفل حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا کے بہت قریبی عزیز تھے اور یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ اہل کتاب کے علوم کے بہت بڑے ماہر تھے۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا اپنے طور پر پہلے بھی ورقہ ابن نوفل کو کچھ تازہ معلومات دیتی رہی ہوں گی کہ میرے شوہر میں یہ تغیرات پیدا ہو رہے ہیں اور اب بھی جا کر حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا نے اپنے اس عزیز سے بات کی اور اگر عزیز اور قریبی رشتہ دار نہ ہوتے تو شاید یہ بات سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ اور اسی سلسلے میں ان سے وقت لے لیا، کہ میں ان کو لے کر آنا چاہتی ہوں۔ اب یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے علم یا اپنی اندرونی کیفیات میں کسی خلا کو پر کرنے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ مسئلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مروت اور دوسرے کے لحاظ کا ہے۔ کہ اتنی جانثار، اتنی سمجھدار اور اتنی وفادار بیوی نے اتنے اہتمام کے ساتھ ایک بندوبست کیا ہے۔ تو کیا میں اسے مسترد کر دوں؟ اگر مسترد کر دیتا ہوں تو اتنی وفا شعار بیوی پر کیا گزرے گی، کیا ان کے خلوص کی ناقدری تو نہیں ہو گی۔ یہ تو میرا کوئی دوست بھی کہتا ہے کہ چلو فلاں حکیم کے پاس آپ کو لے چلتے ہیں تو میرا گہرا دوست ہو گا تو بعد میں چاہے اس کا نسخہ میں استعمال کروں نہ کروں لیکن اس کے کہنے پر ایک مرتبہ چلا ضرور جاؤں گا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مروّتاً اور لحاظ میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ چلے گئے۔ کسی روایت میں آپ کو یہ نہیں ملے گا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں جا کر از خود ورقہ بن نوفل سے کوئی سوال کیا ہو۔ کوئی سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ کیونکہ آپ کو ضرورت ہی نہیں تھی۔ البتہ ورقہ بن نوفل

نے جتنی بات پوچھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادی۔ آگے جو کچھ ہے وہ ورقہ بن نوفل رضی اللہ تعالی عنہ کا از خود کیا ہوا تبصرہ ہے۔ تو بات کو سمجھنے میں الجھن اس لیے پیش آتی ہے کہ جس طرح ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ صرف اپنے لیے ہی کرتے ہیں۔ اپنے اندر کسی چیز کا خلا محسوس ہوتا ہے تو اس کو دور کرنے کے لیے ہم کسی کے پاس جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو بھی ہم نے اسی انداز سے سمجھ لیا۔ آپ کی شخصیت میں مروت اور دوسرے کے جذبات کی رعایت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور آپ کی زندگی کے واقعات کے بین السطور سے آپ مروّت کی جتنی مثالیں نکالتے جائیں گے یہ والا مقدمہ آپ کا مضبوط تر ہوتا جائے گا۔ تو یہاں چونکہ غور کرنے والوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کی شخصیت کا مروت والا پہلو نظر انداز ہو گیا اس لیے بات دوسری طرف کو نکل گئی، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک خاص تجربے سے گذر رہے ہیں اور اس کے بارے میں تشخیص کرانے کے لیے کسی ماہر کے پاس جارہے ہیں۔ اس واقعے کا تعلق رسول اللہ ﷺ کے کسی تردد کے ساتھ نہیں بلکہ حضرت خدیجہ کی ہمدردی اور رسول اللہ ﷺ کی مروّت کے ساتھ ہے کہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ اتنی وفاشعار بیوی نے اتنے اہتمام سے کوئی انتظام کیا اور میں اس سے انکار کردوں، آپ اپنی بیوی کا دل رکھنا چاہتے تھے۔ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کیا سوچ کر یہ سارا کچھ کیا ہوگا اس کی کہیں وضاحت نہیں ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر کسی علمی خلا کا اس کے ساتھ کوئی تعلق موجود نہیں ہے۔

اس سلسلے میں چھوٹی چھوٹی چند مثالیں اور میں عرض کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مرتبہ کہیں سے کچھ[8] چادریں آئیں، بڑی خوبصورت، نقش و نگار والی۔ ان میں ایک چادر سائز میں چھوٹی تھی اور وہ کسی بچی کو ہی آسکتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی کر سکتے تھے کہ کسی صحابی کو دے دیتے کہ لو اپنی کسی بچی کو جا کر پہنا دو ، لیکن جس واقعے کا میں حوالہ دینے لگا ہوں اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں کیا۔ آپ نے اس کام کے لیے انتخاب فرمایا خالد بن سعید رضی اللہ تعالی عنہ کا۔ ان کی ایک چھوٹی بچی تھی جس کی کنیت ام خالد تھی یا نام ہی ام خالد تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ خالد اپنی بیٹی کو لے کر آؤ۔ چنانچہ وہ لے کر آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے وہ چادر اس بچی کے سر پر اوڑھائی۔ یہ اس بچی کو بھی آنے والی زندگی میں فخر کا ایک موقع دینا تھا اور بچی کے والد کو بھی خوشی فراہم کرنا مقصود تھا کہ اللہ کے نبی کے ہاتھ سے میری بیٹی کو جب چیز ملے گی تو اس کی بات ہی اور ہے۔ اور اس کے بعد یہ آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ نقش و نگار والی چادر صرف پہنائی نہیں ، بلکہ بچی کا دل بڑھانے کے لیے اس کے نقش و نگار کی طرف آپ نے متوجہ بھی کیا۔ کالی چادر تھی اور اس پر سبز یا پیلے رنگ کے پھول بنے ہوئے تھے۔ یہ بچی چونکہ پلی بڑھی حبشہ کے اندر تھی اس لیے حبشی زبان کے الفاظ اس کے روز مرہ میں شامل تھے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک زبان دان والا رویہ اختیار نہیں کیا کہ میں اپنی زبان کا معیار کیوں گراؤں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بچی کی سطح پر نیچے اترے۔ یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ میرا جی فلاں لہجہ ہے فلاں ہے، تو میں

---

8. صحیح البخاري، کتاب اللباس، باب ما یدعی لمن لبس ثوبا جدیدا

اس سے ایک لمحے ادھر ادھر ہو جاؤں گا تو میری زبان کی ثقاہت متاثر ہو گی۔ لیکن جس زبان کی ثقاہت واقعی ہوتی ہے وہ اخلاق سے نیچے نہیں جاتی، بلکہ اوپر ہی جاتی ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بچی کو فصیح عربی میں بھی کہہ سکتے تھے کہ یہ بہت خوبصورت ہے۔ لیکن فصیح و بلیغ زبان ادبی محفل میں تو سجتی ہے، ایک بچی کے سامنے یا ایک بچے کے سامنے نہیں جچتی۔ بچے کی نفسیات کو جہاں اپیل کرنا مقصود ہو وہاں اور طرح کی زبان سجتی ہے۔ آپ نے حبشی زبان کا لفظ استعمال فرمایا۔ ہم سیدھے سادھے انداز سے لے لیتے ہیں کہ یہ لفظ بھی عربی ہی بن گیا تھا، معرّب تھا، اس لیے آپ صلی اللہ علی وسلم نے استعمال فرمالیا۔ لیکن یہ بات نہیں ہے۔ اگر اس کا پس منظر دیکھیں، اس لڑکی کا حبشی پس منظر دیکھیں تو بات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بچی کی سطح پر نیچے اتر آئے اور کہ رہے ہیں "ھذا سنا" یہ دیکھو یہ کتنا اچھا ہے، یہ پھول، جس طرح بچوں کو کہا جاتا ہے۔

ہمارے ایک بزرگ حضرت مولانا مجاہد الحسینی رحمہ اللہ تعالی فرمایا کرتے تھے کہ "سنا" کا جو لفظ ہے، اس کے معنی خوبصورت کے ہوتے ہیں، یہ پنجابی لفظ جو "سوہنا" ہے یہ بھی اسی سے نکلا ہوا ہے۔ یا اسی سے ملتا جلتا ہے۔ تو خیر زبانوں کے آپس میں تعلقات تو ہوتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ کوئی ان کا تعلق ہو۔ میرا اس پہ کوئی خاص مطالعہ نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کم عمر صحابی ہیں مسور بن مخرمۃ۔ بہت بچپن کا دور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پایا ہے۔ ان کے والد تھے مخرمۃ بن نوفل رضی اللہ تعالی عنہما۔ یہ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے۔ یعنی قریش کے ان لوگوں میں

شامل تھے جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے۔اور مسلمان ہونے کے بعد اور فتح مکہ کے بعد مدینہ منورۃ منتقل ہو گئے۔ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کہیں سے کچھ قبائیں [9] آئیں۔قبائیں یوں کہ لیجیے جیسے ہمارے ہاں شیروانی ہوتی ہے۔یا اس سے ملتا جلتا کوئی لباس تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تقسیم فرمایا۔بطور ہدیے کے آپ کی خدمت میں آئی تھیں۔اگر آپ چاہتے تو خود اپنے پاس بھی رکھ سکتے تھے۔آپ بیچ کر بھی استعمال کر سکتے تھے۔کیونکہ ہدیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال تھا۔لیکن آپ نے انھیں تقسیم فرمادیا۔اور تقسیم میں آپ کی خالص صواب دید چلنی تھی۔ قانونی پہلو یہی تھا۔کیونکہ جب آپ کو ہدیے میں چیز دی گئی تو آپ کی ملکیت میں آگئی۔آپ جس کو چاہیں دیں، جس کو چاہیں نہ دیں۔اس پر اگر کوئی کہتا ہے کہ مجھے نہیں ملی تو قانونی جواب تو بہت سیدھا سادا ہو سکتا ہے کہ میری ملکیت تھی میں نے کسی کو نہیں دی تو اس پر کسی کو کیا اعتراض۔اور خاص طور پر جس وقت میں تقسیم کر رہا تھا اس وقت متعلقہ بندہ موجود ہی نہیں تھا تو کیا اعتراض۔ لیکن ہر جگہ قانون نہیں چلتا۔قانون سے ہٹ کر بھی کچھ چیزیں ہوتی ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت مخرمۃ کے مزاج کا بھی اندازہ تھا اور کچھ اخلاقی مصلحتیں بھی آپ کے ذہن میں تھیں۔آپ نے پہلے سے ہی ایک قبا نکال کر الگ رکھ لی کہ یہ مخرمہ کو دینی ہے۔مخرمہ کو پتہ چلا کہ قبائیں بٹی ہیں اور مجھے نہیں ملیں۔مجھے اندازہ نہیں ہے کہ اس وقت مخرمہ کی عمر کتنی ہو گی۔لیکن ایک خاص عمر کراس کرنے کے بعد آدمی کے مزاج میں کچھ تبدیلیاں بھی آتی ہیں اور وہ بالکل فطری تبدیلیاں ہوتی ہیں۔تو مخرمہ نے اپنے بیٹے مسور سے کہا کہ مجھے نہیں ملی، ابھی مجھے

9 صحيح البخاري، كتاب الأدبِ، بابُ المُدَارَاةِ مَعَ النَّاسِ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے ساتھ لے کر چلو، پتہ کرتے ہیں کہ مجھے کیوں نہیں ملی۔ گھر کے باہر پہنچے۔ مسور کا خیال تھا۔ جو کہ اس وقت تقریباً چھ سات سال کے بچے ہوں گے۔ ان کا خیال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائیں گے تو بات کرلی جائے گی۔ لیکن مخرمہ نے کہا کہ نہیں۔ جاؤ اور ابھی جاؤ۔ چونکہ بچے ہیں ،اس لیے گھر کے اندر جاؤ اور جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کر لاؤ۔ مسور نے کہا کہ اباجان یہ بے ادبی میں کیسے کروں۔ سبحان اللہ۔ ایک سیدھا سادا شخص کے کا اگرچہ سردار ہے لیکن کوئی بہت بڑا لکھا نہیں ہے، لیکن اس نے کیا شان دار تبصرہ کیا "انہ لیس بجبار"[10] ۔ یہ ٹیپ ٹاپ والا اور پروٹوکول والا کوئی بادشاہ نہیں ہے، یہ اللہ کا بندہ ہونے پر فخر کرنے والا نبی ہے۔ اس لیے جاؤ بلا لاؤ۔ اچھا ادھر مسور اندر جا رہے ہیں بلانے کے لیے اور ادھر مخرمہ کی، باباجی کی آواز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں میں پڑی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کندھے پہ وہ قبا رکھ کر خود باہر تشریف لا رہے ہیں۔ اور آکر صرف یہ نہیں کہ مخرمہ کو دی۔ بلکہ مخرمہ کو دکھائی کہ یہ دیکھو اس کے بٹن، یہ دیکھو کتنے اچھے بٹن لگے ہوئے ہیں ۔ میں اگر کسی منصب پر فائز ہوجاؤں، چھوٹے موٹے منصب پر بھی اور میری کوئی حیثیت بن جائے تو میں شاید اپنے خدام سے یا اپنے چھوٹوں سے اس طرح کی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر کہ یہ کوٹ کے بٹن کیسے ہیں؟ یہ ٹوپی کیسی ہے؟ اس چشمے کی ساخت کیسی ہے؟ میں اپنی شان کے خلاف سمجھوں گا۔ ہاں کسی میس میں بیٹھ کر اپنے جیسے کسی افسر کے سامنے اس موضوع پر بات کرلوں تو کرلوں۔ "انہ لیس بجبار" ۔ خود تشریف لائے اور آکر صرف یہ نہیں کہ ان کو پکڑا دیا بلکہ ان کو دکھایا

---

10 صحیح البخاري، کتاب اللباس، باب المزرر بالذهب

کہ یہ دیکھو اس میں یہ بناوٹ یوں ہے، یہ بناوٹ یوں ہے۔ بخاری کی روایت میں آتا ہے کہ اس کے بٹن مخرمہ کو دکھائے کہ یہ دیکھو اس کے بٹن کتنے اچھے لگے ہوئے ہیں۔ اور پھر روایت میں لفظ آتا ہے کہ "رضي مخرمة"[11] بعض شارحین نے تو کہا ہے کہ یہ مسور کے الفاظ ہیں۔ لیکن لگتا یہ ہے کہ یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں۔ کہ باباجی خوش ہو گئے؟ راضی ہو گئے باباجی؟

تو یہ چیزیں چھوٹی چھوٹی ہیں لیکن اپنے اندر یہ مزاج انسٹال کرنا کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی دیکھنا ہے یہ بھی اسوۂ حسنہ کا حصہ ہے۔ مسور بن مخرمہ صحابہ میں سے ہیں اور ہر صحابی ہی جلیل القدر ہوتا ہے، لیکن صحابہ کی درجہ بندی کے اعتبار سے اگر دیکھیں تو اس آخری درجے میں آتے ہیں جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے۔ اور وہ دور بھی گذر چکا ہے جبکہ مصلحت کے تحت تالیفِ قلب کی ضرورت تھی۔ ایک وقت تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ سرداروں کی تالیف کی اور بڑی تعداد میں اونٹ عطا فرمائے۔ لیکن اب وہ وقت بھی گذر گیا تھا۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ تالیف قلب کا باب حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے بند کیا ہے، جو باب اللہ کے نبی ﷺ نے کھولا ہو وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ مستقل طور پر بند نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں جب تمام قبائلِ عرب نے اسلام قبول کر لیا اور فتحِ مکہ کے بعد اس کو تقریبا سال سمجھیں لگا، عام الوفود جب گذر گیا تو اس کے بعد کوئی ایسی مثال ملتی ہو جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی

---

11 صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب المداراة مع الناس

تالیفِ قلب کی ہو جس طرح فتح مکہ کے فوراً بعد کی تھی۔ شاید کوئی اکا دکا مثال ملے، کوئی زیادہ مثالیں آپ کو نہیں ملیں گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تالیف کا دروازہ خاص مصلحتوں کے لیے کھولا گیا تھا، جوں جوں ان مصلحتوں کی ضرورت کم ہوتی گئی اسی حساب سے تالیفِ قلب کے واقعات میں کمی آتی گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے تک ان مصلحتوں کا تقاضا بالکل ختم ہو گیا تھا اس لیے آپ نے یہ سلسلہ روک دیا۔ تاہم اگر کبھی کسی جگہ اس طرح کی صورتِ حال بنے گی تو یہ دروازہ پھر کھل جائے گا۔ البتہ ایک چیز تھی تھوڑی سی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درحقیقت اس کو بھی پیش نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ یہ تھا کہ مکے کے جو نو مسلم تھے ان کے ساتھ چونکہ جنگیں بہت شدید ہو چکی تھیں اور جنگ اپنے اثرات چھوڑتی ہے، اس لیے پچھلی اسلامی سوسائٹی کے ساتھ ان لوگوں کے گھلنے ملنے میں کچھ وقت لگ رہا تھا۔ اور اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد اقدامات کیے ہیں۔ اور اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بھی یعنی قدیم الاسلام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بھی، ان کے ذہن میں چیزیں ڈالنے کے لیے بھی اور اگر بعد میں کہیں کوئی اونچ نیچ ہو گی تو ان کی دلداری کے لیے یعنی نو مسلم حضرات کی دلداری کے لیے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قدم اٹھائے۔ کہ کسی جذباتی کی زبان سے کوئی بات اگر نکل گئی ہو تو یہاں سے اس کا تدارک ہو جائے۔ یہ ہوتی ہیں باریکیاں۔

اب باریکیوں سے مجھے ایک مثال یاد آئی، قریب زمانے کی۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے ایک خلیفہ مجاز تھے ملتان میں۔ حاجی محمد شریف صاحب رحمہ اللہ۔ بہت ہی متواضع طبیعت کے انسان تھے۔ ہم جب بچپن میں ملتان میں تھے تو حضرت کی خدمت

میں حاضری بھی ہوتی تھی۔انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں ایک بات لکھی ہے۔کہ ان کی پہلی اہلیہ کا انتقال ہو گیا تھا۔اور اس سے ان کی ایک بیٹی تھی۔ان کی شادی ہو گئی۔اور ظاہر ہے کہ بیٹیاں جب آتی ہیں عید وغیرہ کے موقع پر تو لینا دینا بھی ہوتا ہے۔تو یہ بھی بطور والد کے لینا دینا کرتے رہتے تھے۔لیکن ان کی دوسری اہلیہ نے، وہ بھی مولانا تھانوی کی مرید تھیں۔انہوں نے ایک نکتے کی طرف ان کی توجہ دلائی کہ آپ نے اپنی بیٹی کو جتنے پیسے دینے ہوتے ہیں، وہ آدھے آپ خود دیا کریں، آدھے مجھے دیا کریں، میں اسے دے دیا کروں گی۔اس میں کیا حکمت ہے؟اس میں حکمت یہ ہے کہ وہ جب یہاں آئے گی تو اس کو اپنی ماں کی کمی کا احساس نہیں ہوگا، کہ مجھے دینے والا، میرے سر پہ دستِ شفقت رکھنے والا صرف باپ ہے میری ماں نہیں ہے۔ مجموعی طور پر ان تمام واقعات سے جو بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جس کے ساتھ آپ کا معاملہ ہے اس کے اندر گھس کے پہلے آپ اس کو پڑھیں۔اس کے احساسات کو سمجھیں پھر آپ اس کے ساتھ کسی قسم کا معاملہ کریں۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کے ساتھ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرح کے واقعات جہاں آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کے مزاج کو مد نظر رکھا اور اس کے مطابق آپ کے ساتھ برتاؤ کیا، بہت زیادہ ہیں۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی ازواج مطہرات کے ساتھ آپ کا وہ برتاؤ نہیں تھا۔وجہ اس کی یہ ہے کہ امہات المؤمنین میں حدیث کی روایتیں سب سے زیادہ ہیں ہی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے۔اگر باقی امہات المؤمنین بھی کثرت سے روایت کرنے والی ہوتیں تو وہ بھی شاید اپنے ساتھ ہونے والے اس طرح کے واقعات نقل کرتیں۔

اسی سلسلے میں حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اگر حالات زندگی کو دیکھیں، یہ چونکہ ایک اجنبی سوسائٹی سے آئی تھیں، عرب سوسائٹی سے ان کا تعلق نہیں تھا۔ ایک یہودی سردار کی بیٹی تھیں۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اگر ہم دیکھیں تو جگہ جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سوسائٹی میں نہ ہونے کی وجہ سے جو احساس ممکنہ طور پر آدمی کے اندر ہو سکتا ہے اس کے ازالے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ازواج مطہرات میں آپس میں کچھ ہو جاتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عموماً مداخلت نہیں کیا کرتے تھے اور یہ بھی ایک زندگی کا ادب ہے۔ میں واقعات کو تفصیل سے اس لیے نہیں بیان کر رہا کہ کہیں بات لمبی نہ ہو جائے۔ لیکن اس طرح کے کئی واقعات ہیں جن میں دو ازواجِ مطہرات کے درمیان کوئی معاملہ ہوا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کی۔ یہ اصل میں میں اور آپ ہوتے ہیں کہ جتنی ہماری عمر بڑھتی چلی جاتی ہے اتنا ہی ہمارے اندر یہ احساس پختہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ جو مسئلہ بھی حل ہو گا وہ میرے وجود سے ہی حل ہو گا۔ میرے علاوہ کوئی کسی مسئلے کو حل کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے بزرگ مرد اور بزرگ خواتین اپنے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کے رشتے بھی اپنی زندگی ہی میں کر کے جاتے ہیں کہ بعد میں پتہ نہیں کسی کو رشتے کرانے آئیں گے یا نہیں۔ پتہ نہیں مسئلہ حل ہو گا یا نہیں۔ دوسروں کے معاملے میں عدمِ مداخلت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اگلے پر اعتماد کر رہے ہیں۔ کہ آج یہ آپس میں تو تو میں میں کر رہی ہیں تو کل کو انہوں نے آپس میں بالکل ٹھیک بھی

ہو جاتا ہے۔ان کو پتہ ہے ہمارے معاملات کیسے ہیں، خود ہی حل کر لیں گی۔یہ ازواج مطہرات پر اعتماد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔

صحیح بخاری کی ایک لمبی روایت ہے [12] جس کے شروع میں آتا ہے کہ ازواج مطہرات کے دو گروہ تھے۔دو گروپ تھے۔ایک کی لیڈر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا تھیں اور ایک کی لیڈر حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالی عنہا تھیں۔توان کا کچھ معاملہ تھا۔معاملے کا اختتام یہاں پر ہوا کہ حضرت زینب رضی اللہ تعالی عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کے پاس آئیں اور کچھ کھری کھری سنائیں۔ان کے حساب سے کھری کھری ہی ہوں گی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا خاموش رہیں۔اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دیکھتے رہے۔کچھ نہیں کہا۔جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے زیادہ ہی کچھ کہا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دینا شروع کیا تو بعض روایتوں میں لفظ آتے ہیں "حتی جف ریقھا فی فمھا" [13] کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے منہ کا لعاب خشک ہو گیا۔یعنی ان کو آگے سے کوئی بات نہیں آرہی تھی۔خاموش کرادیا انہیں۔تو آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اتنا تبصرہ فرمایا کہ "ہے تو بہر حال صدیق کی بیٹی

---

12 صحيح البخاري، كِتَاب الْهِبَةِ وَفَضْلِهَا وَالتَّحْرِيضِ عَلَيْهَا، بَابُ مَنْ أَهْدَى إِلَى صَاحِبِهِ وَتَحَرَّى بَعْضَ نِسَائِهِ دُونَ بَعْضٍ

13 سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، بابُ: حُسْنُ مُعَاشَرَةِ النِّسَاءِ (بلفظ: وقد يبس ريقها في فيها)

فتح الباري، كتاب الهبة وفضلها والتحريض عليها، باب من أهدى إلى صاحبه وتحرى بعض نسائه دون بعض

(بھذا اللفظ بحوالہ سنن نسائی وابن ماجہ)

نا"۔ جو کمالات، جو صلاحیتیں، جو فصاحت و بلاغت اس کے باپ کو حاصل ہیں وہ اسے بھی حاصل ہے۔ اس سے زیادہ ان دونوں کے معاملے میں ان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ کہ آؤ میں صلح کراتا ہوں۔ میں یہ کرتا ہوں میں وہ کرتا ہوں۔ سرپرستی کا شوق۔ حالانکہ اللہ کے نبی سے بڑھ کر کوئی اور سرپرست نہیں ہو سکتا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ ادب سکھایا کہ اگر چار سال اللہ نے آپ کی عمر بڑی کردی ہے یا کسی اور حوالے سے اللہ نے آپ کو بڑا بنادیا ہے تو ہر معاملے میں سرپرستی کا شوق نہیں ہونا چاہیے بلکہ فطری انداز سے لوگوں کو اپنے مسائل ،اپنے معاملات کو خود بھی حل کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ یہ تصور بھی کرلینا چاہیے کہ دوسروں کے اندر بھی کوئی صلاحیت موجود ہے۔

میں عرض کررہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا عمومی انداز یہ تھا کہ آپ ازواجِ مطہرات کے آپس کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے لیکن حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالی عرب سوسائٹی سے نہیں تھیں، بلکہ خیبر کے ایک سردار کی بیٹی تھیں۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر یہ بھی جنگی قیدیوں میں شامل تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں اختیار دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ تمھارے سامنے دو راستے ہیں ان میں سے جس کو تم منتخب کروگی اسی کے مطابق عمل ہوگا۔ ایک راستہ تو یہ ہوگا کہ تم اپنے خاندان میں لوٹنا چاہتی ہو تو ایسی صورت میں پوری سیکیورٹی کے ساتھ وہاں پہنچانے کا انتظام کردوں گا۔ دوسرا یہ کہ تم مسلمانوں میں رہو، ایسی صورت میں تمھیں عام کنیزوں کی طرح رکھنے کی بجائے تمھیں ام المؤمنین بنا کر رکھوں گا۔ ان میں جو راستہ تمھیں پسند ہو بتادو۔ انھوں نے عرض کیا یارسول اللہ آپ کی محبت پہلے ہی

میرے دل میں جا گزیں ہو چکی ہے، اس لیے اب مجھے اپنے خاندان میں کوئی رغبت نہیں ہے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے اس فیصلے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ نکاح کر لیا اور خیبر سے واپسی پر ہی راستے میں ان کا ولیمہ کیا۔[14]

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کا نکاح اگرچہ خود انھی کی رضا اور رغبت سے ہوا تھا، مگر پھر بھی بہر حال کسی عرب خان دان سے ان کا تعلق نہیں تھا، اس لیے یہ امکان تھا کہ تنہائی کا اثر لے لیں۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تو یہ کیا کہ اپنی ایک کنیز جو آپ کی خدمت کیا کرتی تھیں وہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیں۔ ان کنیز کا نام رُزَینہ تھا اور یہ بھی یہود میں سے تھیں، اس لیے یہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے لیے موزوں ترین تھیں۔ دوسرے جس طرح باقی ازواجِ مطہرات کے معاملات میں آپ دخل نہیں دیا کرتے تھے، بلکہ وہ خود ایک دوسرے سے جو کچھ کہنا سننا ہوتا وہ کر لیتیں۔ مگر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ معمول نہیں تھا، بلکہ اگر کوئی ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو کچھ کہتیں تو رسول اللہ ﷺ خود کچھ ارشاد فرما دیتے۔ ایک دفعہ حضرت حفصہ نے ان سے کہہ دیا کہ تم تو ایک یہودی کی بیٹی ہو، اس پر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا رو پڑیں، جب رسول اللہ ﷺ کو پتا چلا کہ رو رہی ہیں اور اس وجہ سے رو رہی ہیں تو آپ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی بات کا جواب سکھاتے ہوئے فرمایا کہ تم ایک نبی کی بیٹی ہو (یہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھیں) تمھارے چچا یعنی موسی علیہ السلام بھی نبی ہیں،

---

14 ملاحظہ ہو تکملۃ معارف السنن ج ۲ ص ۲۴۵ باب ماجاء فی الولیمۃ

گویا ایک نبی کی تم بھتیجی ہو اور اب ایک نبی کی تم بیوی ہو، تو حفصہ رضی اللہ عنہا تم پر کیسے فخر کر سکتی ہیں۔ پھر آپ نے حضرت حفصہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا اے حفصہ رضی اللہ عنہا اللہ سے ڈرو۔[15]

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں تو جمہور کے قول کے مطابق عمر بہت کم تھی۔اور ساتھ کھلونے بھی لے کر آئی تھیں۔اب وقت گذر چکا، سالہا سال گذر چکے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا بڑی ہو چکی ہیں۔ لیکن کھلونے ابھی موجود ہیں۔ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لائے، بے تکلفی کی باتیں ہو رہی تھیں۔اسی دوران حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں جو الماری تھی، جو طاقچہ سا تھا اس کے اوپر کوئی دروازہ وغیرہ لگا ہوا نہیں تھا، بلکہ کپڑے کا سادہ پردہ لٹکا ہوا تھا۔ ہوا چلی اور وہ پردہ ہٹا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیچھے یہ کھلونے وغیرہ نظر آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے مختلف چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھنا شروع کر دیا کہ یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہے؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بتاتی چلی گئیں اپنے انداز سے۔ایک چیز کے بارے میں پوچھا کہ اس کے اوپر یہ کپڑے کے ٹکڑے سے لگے ہوئے ہیں یہ کیا ہے؟[16] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ یہ گھوڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ گڑیاں ہیں تو انہوں نے کہیں آنا جانا بھی ہو گا تو گھوڑا بھی چاہیے۔ جنھوں نے گڑیوں کا بچیوں کا کھیل دیکھا ہے وہ اس بات کو سمجھ سکتے

---

15 جامع الترمذی، أبواب المناقب: باب ماجاء فی فضل أزواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم

16 سنن ابی داود، کتاب الأدبِ، باب فِی اللَّعِبِ بِالبَنَاتِ

ہیں کہ گڑیوں کے ساتھ ان کے لوازم بھی ہوتے ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ تو ٹھیک ہے میں سمجھ گیا یہ گھوڑا ہے لیکن اس پر جو کپڑے کے ٹکڑے سے لگے ہوے ہیں یہ کیا ہے؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا، یہ گھوڑے کے پر ہیں۔ آپ نے فرمایا "فرس لہ جناحان؟" پروں والا گھوڑا؟ گھوڑے کے بھی بھلا پر ہوتے ہیں؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے، یعنی اب بڑی ہو چکی ہیں لیکن وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر اپنے بچپن میں لوٹ گئی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ آپ کو نہیں پتہ؟ حضرت سلیمان علیہ السلام کے جو گھوڑے تھے ان کے پر ہوتے تھے۔ یعنی سادہ لفظوں میں یہ کہہ لیجیے کہ آپ نے میرے گھوڑوں کو معمولی سمجھا ہے، یہ سلیمانی گھوڑے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مسکرا دیے۔ لیکن جو بات یہاں سمجھنے کی ہے میرے اور آپ کے لیے۔ وہ یہ ہی چھوٹی چھوٹی باتیں دیکھنے کی عادت۔ اور وہ تب ہوتی ہے جب کہ فکر مندی اپنے اوپر سوار کی جائے کہ دوسرے کو سمجھنا ہے اس کے مطابق چلنا ہے۔ بہر حال جو بات یہاں سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پتہ تھا بظاہر کہ اس الماری میں کیا رکھا ہوا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نو عمر ہیں۔ میں اگر ہوتا۔ میرے جیسا کوئی اور ہوتا تو وہ تو خیال رکھتا کہ بھئی نظر رکھنی چاہیے۔ کیا چیزیں ہیں؟ اس کا موبائل چیک کرنا چاہیے۔ کبھی کوئی چھاپہ مارنا چاہیے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے کبھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس الماری کی تلاشی لینے کا ارادہ نہیں کیا، اب پردہ خود سرکا تو آپ کو پتہ چلا کہ یہاں کیا رکھا ہوا ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ کا معمول تھا، صحابہ کو بھی یہ ہدایت دی کہ گھر میں لمبے سفر سے واپس آؤ تو اچانک نہیں آنا۔ اور خود بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس آتے

تھے تو کچھ وقت مسجد میں گذارتے تھے۔اس میں اور بھی بہت ساری حکمتیں تھیں۔ایک حکمت یہ بھی تھی کہ ازواج مطہرات کو علم ہو جاتا تھا کہ آپ مدینے میں تشریف لا چکے ہیں اس کے بعد آپ گھر تشریف لے جاتے، اچانک گھروں میں نہیں جاتے تھے۔تو اتنے سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی الماری چیک نہیں کی۔یہ ہے اس واقعے کا بین السطور۔تو میں جو عرض کر رہا تھا، وہ تھا سیرت کے واقعات کا بین السطور سمجھنا۔

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کہیں پیدل جا رہے تھے، کوئی صاحب اپنے گدھے پر سوار ہو کر جا رہے تھے، تو ان صحابی نے خود پیچھے ہو کر اور اگلی سیٹ خالی کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ اس پر سوار ہو جایئے، یعنی اگلی خالی کی ہوئی سیٹ پر تشریف رکھیے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، چونکہ سواری تمھاری ہے اس لیے اس کی اگلی سیٹ پر بیٹھنا تمھارا حق ہے، اِلا یہ کہ تم اپنی رضامندی سے میرے لیے اپنے اس حق سے دستبردار ہو جاؤ، اس نے عرض کیا کہ میں اپنے حق سے آپ کے لیے دستبردار ہوتا ہوں، یہ سن کر رسول اللہ ﷺ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔[17] یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مالک کی رضامندی ہی درکار تھی تو وہ تو اسی وقت ظاہر ہو گئی تھی جب ان صاحب نے اگلی سیٹ خالی کر کے نبی کریم ﷺ کو اس پر بیٹھنے کی دعوت دی تھی۔ اصل بات کچھ اور ہے۔وہ یہ ہے اس کے از خود پیچھے ہٹنے میں یہ امکان تھا کہ وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ جب دینی اعتبار سے یا دنیوی اعتبار سے بڑی شخصیت سامنے آجائے تو پروٹوکول کا

17 سنن ابی داود، حدیث نمبر ۲۵۷۲ کتاب الجهاد، باب رب الدابۃ احق بصدرہا

تقاضا یہ ہے کہ اس شخصیت کے لیے اگلی سیٹ خالی کر دی جائے۔ اگر اس کا ذہن یہی ہوتا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے حق سے واقف ہی نہیں تھا، وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس طرح کی شخصیت کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نہیں چاہتے تھے اس کی ناواقفیت اور اپنے مقام و مرتبہ سے فائدہ اٹھائیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے پہلے اسے اصول سمجھایا اور اسے سمجھایا کہ یہ سیٹ میرے لیے خالی کرنا تمھاری ذمہ داری نہیں، بلکہ یہ حق تمھارا ہی ہے۔ جب تک اسے اپنے حق کا علم نہیں تھا، یا کم از کم علم نہ ہونے کا امکان تھا تب تک رسول اللہ ﷺ نے اس کی دستبرداری کو بھی معتبر نہیں سمجھا۔ دستبرداری وہ معتبر ہوتی ہے جہاں دوسرا فریق اپنے حق کا شعور رکھتا ہو۔

ایک بات عرض کر کے میں اپنی گذارشات کو ختم کرتا ہوں۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی جیسا کہ ان چند واقعات سے سامنے آیا، بہت زیادہ سوشل تھی۔ لیکن ایک موقعے پر ہمیں نظر آتا ہے کہ جیسے آپ پر نعوذ باللہ بہت زیادہ خشکی طاری ہو گئی ہو۔ اور اس کو سمجھنے میں بھی بعض اوقات غلطی ہو جاتی ہے۔ اور وہ ہے افک کا واقعہ۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا بہت تفصیل سے وہ واقعہ روایت[18] کرتی ہیں۔ اور ان سے آگے متعدد تابعین نے روایت کیا ہے۔ اور ان سے ابن شہاب زہری نے ان سب تابعین کی روایت کو ملا کر روایت کیا ہے۔ پورا واقعہ پڑھیں تو دیکھنے میں بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس معاملے میں متردد ہیں کہ پتہ نہیں حقیقت کیا ہے۔ آپ کا پچاس فیصد ذہن اِدھر ہے، پچاس فیصد ذہن اُدھر ہے۔ بادی

18 صحیح البخاري، کتاب المغازي، باب حدیث الإفك

النظر میں ایک یہ تاثر ملتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اور اس کی دلیل میں یہ دیا کرتا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا کہ فلاں باندی سے پوچھ لیا جائے۔ اگرچہ صحیح بخاری کی روایت میں یہ آتا ہے کہ وہ باندی حضرت بریرۃ رضی اللہ عنہا تھیں۔ لیکن صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حبشہ کی ایک باندی تھی اور بہت ہی فقیہہ اور سمجھدار قسم کی باندی تھی۔[19] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان سے پوچھا تو انہوں نے یہ کہا کہ بچپن کے تقاضے کے تحت گھر کے کاموں میں تو سستی ہو جاتی ہے، کہ آٹا گوندھ کر رکھ دیا اور بکری آکر آٹا کھا گئی۔ وہ سنبھالا نہیں گیا۔ لیکن اس طرح کے معاملے میں کسی قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔ کردار پر حرف گیری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ چند سال کی رفاقت سے اگر ایک باندی کو ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں یہ وثوق اور یقین ہو سکتا ہے تو سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں نہیں ہو سکتا؟ آپ تو بچپن سے جانتے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آپ دوست ہیں۔ پیدائش کے زمانے سے جانتے ہیں۔ ان کی براءت کا یقین یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک افواہ کی وجہ سے اس میں کمی واقع ہو جائے۔ مگر دیکھنے میں لگتا یہی ہے کہ شاید آپ متردد ہیں۔ لیکن وہاں ایک اور چیز میں عرض کروں کہ بعض اوقات آدمی کو

---

[19] وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرت بریرۃ جب آزاد ہو کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کی مولاۃ بنی ہیں تب حضرت عباس اور ابن عباس رضی اللہ عنہما مدینہ منورہ میں موجود تھے، اس لیے حضرت بریرۃ کی آزادی یقیناً فتح مکہ کے بعد ہوئی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم پر تہمت کا واقعہ اس سے بہت پہلے کا ہے، اس کے علاوہ متعدد روایات ایسی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کالی باندی تھیں، جبکہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہم کی رنگت کالی نہیں تھی۔ تفصیل زیرِ تالیف تکملۃ معارف السنن کی تیسری جلد میں پیش کی جائے گی۔

اَن سوشل بھی ہونا پڑتا ہے۔ آدمی کے منصب کے وہ تقاضے ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس موقعے پر ایک پہلو تو وہ اس سازش کا ہے جو اس کے پیچھے موجود ہے، لیکن ایک پہلو یہ ہے کہ الزام کتنا ہی جھوٹا سہی لیکن ایک الزام کھڑا تو ہو گیا ہے۔ اور ریاست کے سربراہ سرور دو عالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس الزام کے سچا یا جھوٹا ہونے کا فیصلہ بظاہر جب بھی کرنا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کرنا ہے۔ کیونکہ اس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ براہِ راست وحی نازل ہو گی، بلکہ خود حضرت عائشہ کے بیان کے مطابق خود انھیں بھی اس کی توقع نہیں تھی۔ اب اللہ کے نبی ﷺ پہلے دن سے ہی یہ کہہ دیتے کہ بالکل جھوٹ ہے تو یہ آپ کے منصب کے تقاضوں کے خلاف ہوتا۔ قاضی کا اپنا ذاتی علم جو بھی ہو لیکن پروسیجر میں وہ اس وقت تک لاتعلق رہتا ہے جب تک کہ کاروائی مکمل نہ ہو جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہاں جو پوزیشن ہے وہ اس بات کا تقاضا کرتی تھی کہ کچھ عرصے کے لیے اپنے آپ کو بیلنس رکھا جائے۔ لیکن ایک وقت گذرنے کے بعد پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محسوس ہوا کہ اب بات آگے بڑھ گئی ہے۔ اب اس موضوع پر عوامی گفتگو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں آپ کے الفاظ ہیں کہ "لا اعلم منها الا خیرا" (میں ان "حضرت عائشہ" کے بارے میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانتا)۔ اور صفوان ابن معطل رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی یہی الفاظ ہیں کہ "لا اعلم منه الا خیرا" (میں ان کے بارے میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانتا)۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معاملے میں تردد نہیں تھا، یا یہ سمجھنا کہ آپ کا ذہن آدھا ادھر اور آدھا

ادھر تھا، یہ بات نہیں تھی، دِکھنے میں جو تردد لگ رہا ہے یہ در حقیقت آپ کی پوزیشن کا ایک تقاضا تھا۔

اس سے آگے بڑھ کر پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے پوچھا، کہ صحیح صحیح بات بتادو معاملہ کیا ہے؟ یہاں پر بھی تھوڑا سا رکنے کی ضرورت ہے۔ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو مشورہ کر رہے ہیں، تو پہلے مرحلے پر ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیوں نہیں پوچھا؟ یہ نہ پوچھنا بھی در حقیقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کی رعایت کے لیے ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے بہت مشکل اور نازک مرحلہ تھا۔ لیکن بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کی ایک تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا، اور اس خطبے کے کچھ وقت گذرنے کے بعد جب کہ ابھی تک وحی بھی نہیں آئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اور بڑے اقدام کا اپنے ذہن میں ارادہ فرمایا ہو گا۔ اس اقدام سے پہلے اپنے منصب کے تقاضے کے تحت جس پر تہمت ہے اس سے ایک مرتبہ پوچھنا ضروری سمجھا۔ پوچھنا بھی منصب کے تقاضے کے تحت ہو گا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی تردد کے تحت نہیں۔ اور جب پوچھا جاتا ہے تو پھر قاضی یہ نہیں کہتا ملزم کو کہ ہو تو تم سچے ہی لیکن پھر بھی بتادو کہ تم سچے ہو یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ قاضی کا یہ منصب نہیں۔

اسی کی ایک اور مثال میں عرض کردوں کہ کچھ منصب کے تقاضے ہوتے ہیں۔ایک مرتبہ ایک خاتون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔[20] وہ پہلے رفاعہ قرظی کے نکاح میں تھیں۔اب کسی اور کے نکاح میں آچکی تھیں۔اوران سے طلاق لے کردوبارہ پہلے خاوند کی طرف جاناچاہتی تھیں۔لیکن اس سلسلے میں ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ میرے دوسرے خاوند میں مردانہ صلاحیت نہیں ہے۔لیکن یہ بات بہت زیادہ صریح الفاظ میں انہوں نے کہی۔اس کے جواب میں بخاری ہی کی ایک روایت میں آتا ہے اور مسلم میں اس سے بھی زیادہ تفصیل سے، کہ ان کے خاوند نے اپنی اس معاملے میں اہلیت کو اس سے بھی زیادہ صریح الفاظ میں بیان کیا۔تو جنسی صلاحیت اور جنسی تعلق کے بارے میں صریح الفاظ کا تبادلہ ہورہاہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اندر موجود ہیں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ موجود ہیں اور یہ میاں بیوی موجود ہیں۔خالد ابن سعید رضی اللہ عنہ دروازے سے باہر موجود ہیں،ان تک آواز آرہی ہے۔ انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو باہر ہی سے آواز دے کر کہا،اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اس طرح کھلی ڈلی بات ہورہی ہے،ان کو روکو تو سہی۔لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی نہیں روکا۔سوال یہ بنتا ہے کہ اس کی وجہ کیا تھی؟رسول اللہ ﷺ بھی اس طرح کی صریح گفتگو سے نہیں روک رہے اور توجہ دلانے کے باوجودابو بکر رضی اللہ عنہ بھی نہیں روک رہے؟

---

20 صحیح البخاري، كِتَاب الشَّهَادَاتِ، بَابُ شَهَادَةِ الْمُخْتَبِي

حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے ایک یہودی کے ساتھ ہم کلامی میں سخت الفاظ بولے گئے۔اور غلطی بد تمیزی اس یہودی کی ہی تھی جس نے[21] "السام علیکم" کہا تھا۔(یعنی تم پر ہلاکت ہو)۔وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کے اندازِ کلام پر گرفت کی تھی اور حضرت عائشہ کو سمجھایا تھا کہ نرمی سے بات کیا کرتے ہیں،اس کی جو بات جواب دینے کے قابل تھی اس کا جواب میں نے دے دیا ہے۔لیکن جواب میں یہ الفاظ جو تم نے استعمال کیے ہیں یہ نہیں ہونے چاہیے تھے۔

لیکن یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کے کلام کو سن رہے ہیں۔خالد ابن سعید رضی اللہ عنہ کو احساس ہے کہ یہ باتیں نہیں ہونی چاہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی منع نہیں کر رہے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی منع نہیں کر رہے،جو اس طرح کے موقع پر منع کر دیا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کوئی غیر سنجیدہ کام نہیں ہونا چاہیے۔

وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرمارہے تھے اور دو بچیاں گانے لگ گئیں اور کچھ چیزیں بجانے بھی لگ گئیں تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے انہیں روک دیا تھا[22]۔روکنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں جائز ناجائز کا کوئی فتوی دے رہے تھے،ابو بکر رضی اللہ عنہ اللہ کے

---

21 صحیح البخاري، كِتَابُ الدَّعَوَاتِ، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يُسْتَجَابُ لَنَا فِي الْيَهُودِ، وَلاَ يُسْتَجَابُ لَهُمْ فِينَا

22 سنن نسائي، کتاب صلاة العيدين، باب: ضَرْبُ الدُّفِّ يَوْمَ الْعِيدِ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں یہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ جائز ناجائز ہونے کا مسئلہ جو بھی ہو بہر حال ہے تو یہ لہو کے قبیل سے، یعنی غیر سنجیدہ فعل ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اس طرح کا غیر سنجیدہ کام آپ کے ادب کے خلاف ہے۔

یہاں اس خاتون اور اس کے شوہر کے معاملے میں بھی رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں اس انداز سے بات ہو رہی ہے جو بظاہر آپ کے ادب کے خلاف ہے لیکن یہاں حضرت ابو بکر بھی خاموش ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ منصب کے تقاضے ہیں، کہ رسول اللہ ﷺ بطور قاضی کے ان کی بات سن رہے ہیں اور قاضی جب فریقین کی بات سنتا ہے تو حتی الامکان وہ فریقین کو اپنے انداز سے گفتگو کرنے کا موقع دیتا ہے، بات بات پر روک ٹوک نہیں کرتا کہ یہ بات کہنی ہے تو یوں کہو، یوں نہ کہو۔ وہ فریقین کو کلام کی شائستگی سکھانے کے لیے نہیں بیٹھا ہوتا۔

ضمناً ایک بات عرض کر دوں کہ سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد، ان کے قصاص یا ان کی شہادت کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعض لوگوں کے ساتھ مکالمات ملتے ہیں۔ اور ان میں بعض اوقات حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انداز بھی بہت نپا تلا ہے۔ یعنی جس طرح سے میں آج حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کو بیان کر سکتا ہوں اور مجھے بیان کرنا چاہیے، وہ چیز وہاں نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اس وقت ایک منصب پر فائز تھے۔ اس منصب کے کچھ تقاضے تھے۔ وہ اپنا رجحان یا اپنی رائے کھل کر بیان کرنے کی

پوزیشن میں نہیں تھے، کیونکہ مقدمہ آپ ہی کی خدمت میں پیش ہونا تھااور آپ نے فریقین کی بات سننی تھی۔یہی وجہ ہے کہ جب کچھ وقت گذرنے کے بعد اس طرح کی چیزوں پر حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سے سوالات کیے گئے تو حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے بڑی وضاحت کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کی صفائی بھی بیان فرمائی اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کے فضائل بھی بیان فرمائے۔اور یہ بھی فرمایا کہ فلاں فلاں قرآن کی آیتیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی تعلق رکھتی ہیں ،حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ بھی اس آیت کی فضیلت کے اندر داخل ہیں۔

آخر میں چونکہ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالی عنہا کی بات آئی ہے، تو ایک وضاحت کرکے میں اپنی گفتگو کو ختم کرتا ہوں۔کہ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالی عنہا ایک یہودی سردار کی بیٹی تھیں۔عام طور پر صحیح بخاری بلکہ صحاح ستہ میں جس انداز سے اس روایت کو لیا گیا ہے اور اسنادی حیثیت سے شاید وہی روایت زیادہ وزنی ہے۔اس میں صرف اتنی بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ رضی اللہ تعالی عنہا کو آزاد کیا اور ان سے نکاح کیا۔یا دوسری تشریح کے مطابق ان سے نکاح کیا اور اس کے بدلے میں انہیں آزاد کیا۔"وجعل عتقها صداقها"[23]۔اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی دیکھتے ہوے کلامی اور فقہی پہلو بعض اوقات سامنے رہتے ہیں، آپ کی زندگی کا اخلاقی پہلو مد نظر نہیں رہتا۔اور اس کی وجہ سے بعض روایتیں ذہن سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔یا اس زمانے میں شاید یہ سمجھا گیا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاقی پہلو تو

---

23 صحیح البخاري، كتاب النكاح، باب من جعل عتق الأمة صداقها

اتنا واضح ہے کہ اس کے متعلق کسی روایت کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جو پوری حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ آزادی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے معاوضے میں ہواس کا یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مصنف عبدالرزاق [24] اور بیہقی [25] کی ایک روایت ہے کہ حجاج بن علاط نامی شخص کسی کام سے خیبر سے مکہ مکرمہ گئے، جاتے ہوئے انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت لی کہ اہل مکہ سے میں نے کچھ وصولیاں کرنی ہیں، مجھے یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھے ایذا نہ پہنچائیں، اس لیے اگر آپ کی اجازت ہو تو اوپر اوپر سے آپ کے خلاف کوئی بات کردوں جس سے وہ وقتی طور پر خوش ہو جائیں، رسول اللہ ﷺ نے اجازت دے دی، انھوں نے مکہ جاتے ہی مشرکین کو یہ بتایا کہ محمد (ﷺ) جنگ ہار گئے ہیں، اس سے مشرکین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی البتہ وہاں جو تھوڑے بہت جو مسلمان تھے وہ پریشان ہو گئے ،حضرت عباس رضی اللہ تعالی عنہ کو سب سے زیادہ فکر تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر گئے ہوے ہیں تو پتہ نئ کیا بنا؟ ان تک جب یہ خبر پہنچی تو ان کے تو پاؤں تلے سے جیسے زمین سرک گئی ہو۔ ہلنے جلنے کے قابل ہی نہیں رہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنا ایک غلام حجاج کے پاس بھیجا کہ صحیح معلومات لے کر آؤ، انھوں نے کہا کہ میں تنہائی میں آپ کو بتاتا ہوں، چنانچہ حجاج نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر آکر بتایا

24 مصنف عبدالرزاق، كتاب المغازي: حديث الحجاج بن علاط

25 سنن البيهقي الكبرى، كتاب السير، باب من أراد غزوة فوري بغيرها

کہ نہیں ایسا نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالی نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خیبر والوں پر غلبہ عطا فرمایا ہے۔اور اس کے بعد یہ بتایا کہ حیی ابن اخطب کی بیٹی صفیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں آئی اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آزاد کر کے یہ اختیار دیا ہے کہ اب تم آزاد ہو گئی ہو، اگر تم چاہتی ہو تو اپنے خاندان کے پاس چلی جاؤ اور اگر چاہتی ہو تو یہاں رہو۔ اگر یہاں رہنا ہے تو پھر ام المؤمنین بنا کر رکھنے کے لیے میں تیار ہوں۔ عبدالرزاق نے یہ روایت نقل کی ہے معمر سے، اور معمر نے روایت کی ہے ثابت بنانی سے اور انھوں نے حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے۔اس سند کے ساری راوی اعلی درجے کے ائمہ ہیں۔اور یہ بات بعض دوسری روایتوں مثلاً طبقات ابن سعد کی ایک روایت میں بھی اسی طرح بات آتی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں آزاد کرنے کا تو میں نے فیصلہ کر لیا ہے، لیکن آزاد ہونے کے بعد کیا کرنا ہے؟ یہ تم بتاؤ؟ دو آپشن ہیں۔ایک آپشن تو یہ ہے کہ اپنے اہل خاندان کے پاس چلی جاؤ۔ اگر ایسا کہو گی تو میں تمہیں وہاں بھیجنے کا بندوبست کر دوں گا۔اور دوسرا آپشن یہ ہے کہ یہاں رہو اور میرے حرم کا حصہ بن جاؤ۔ تو حضرت صفیہ رضی اللہ تعالی عنہا نے اپنے قصد اور ارادے سے اور اپنی آزادانہ مرضی سے اپنے خاندان کو قربان کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔اور اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت سے متعلق کچھ خواب دیکھ چکی تھیں[26]۔اور بالکل جب بچی تھیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینے میں آئے۔ تو اپنے والد کو یہودیوں کے

---

26 الطبقات الکبری لابن سعد، ذکر ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ج8، ص96

ایک عالم سے مکالمہ کرتے ہوئے سن چکی تھیں[27] کہ یا نبی تو یہ وہی ہیں جن کا ذکر ہماری کتابوں میں آتا ہے۔ نبی تو یہ سچے ہیں۔ لیکن بس ہماری مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے ہم ان کی نبوت کا اقرار نہیں کرتے۔ اس زمانے میں بہت سے ایسے مرد اور عورتیں تھی جنھیں رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا یقین ہونے کے بعد اپنے خاندان سے لا تعلق ہونا پڑا، اس میں مردوں کی بھی مثالیں ملتی ہیں اور عورتوں کی بھی، مردوں کی ایک مثال حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ہیں اور عورتوں میں ایک مثال ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ہیں، کہ اپنے والد کی مرضی کے برعکس اپنے سابقہ خاوند کے ساتھ حبشہ چلی گئیں۔ یہاں تو اپنے خاندان سے لا تعلق ہونے کا مسئلہ نہیں تھا۔ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچادیا ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کی حقانیت سے متعلق چیزیں پہلے دیکھ چکی ہیں۔ تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالی عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کو اپنی مکمل آزادانہ مرضی سے اختیار کیا۔ اور اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر ایک کو اس کے مرتبے پر رکھتے تھے۔ کیونکہ یہ ایک سردار کی بیٹی ہیں، اگرچہ انتہائی بدترین قسم کا دشمن سردار ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی مقام اور مرتبے کا لحاظ رکھا کہ نبیوں کی اولاد ہے۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے ہیں۔ اس لیے آپ نے

[27] سیرۃ ابن ھشام، ج 2، ص 376 وعیون الأثر؛ لابن سید الناس، ج 1، ص 517 والروض الأنف؛ للسھیلی، ج 1 ص 277

آزاد کیا اور آزاد کر کے کہا کہ اگر اپنے گھر جانا چاہتی ہو خاندان کے پاس جانا چاہتی ہو تو وہاں بھیجنے کا انتظام کر دوں گا اور اگر ادھر رہنا چاہتی[28] ہو تو ادھر رہنے کی شکل یہ ہو گی۔

یہ چند مثالیں ہیں اور مجھے احساس ہو رہا ہے کہ شاید میں نے آپ حضرات کا زیادہ وقت لے لیا ہے، زیادہ سمع خراشی کر لی ہے۔ اس سے صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو آپ کے واقعات زندگی کے بین السطور سے بھی ہمیں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور اس سے جو چیزیں ہمیں سمجھ میں آتی ہیں ان کو سادہ انداز میں عوام میں کیسے لانا ہے؟ اس کے لیے بھی ہمیں سوچنا چاہیے۔ اور ہمارے موضوعات سیرت میں یہ چیز بھی شامل ہونی چاہیے۔ جیسے کسی کمپنی کا آر اینڈ ڈی جو ہوتا ہے، ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ کا حصہ ہوتا ہے وہ صرف اس پہ غور نہیں کرتا کہ یہ مائیک نیا بنے گا تو کیسا بنے گا؟ بلکہ وہ اس پر بھی غور کرتا ہے کہ اس مائیک کو پھر آگے مارکیٹ کیسے کرنا ہے؟

ہم بعض اوقات سیرت پہ تحقیق تو بہت اچھی کر لیتے ہیں اور یقیناً وہ بھی ایک بہت بڑا علمی کام ہے لیکن یہ امت صرف علمی امت نہیں ہے، علمی امت ہونے کے ساتھ ساتھ امتِ دعوت بھی ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہماری ریسرچ کے جو نتائج ہیں اس کو مارکیٹ کرنے کا طریقہ بھی سوچیں۔ اور یہ بھی ہماری ریسرچ ہی کا حصہ ہونا چاہیے۔ اس طویل سمع خراشی پر ایک مرتبہ پھر میں معذرت خواہ ہوں۔ اور جناب ڈاکٹر

---

28 سنن البیھقی الکبری، کتاب السیر، باب من أراد غزوۃ فوری بغیرھا

صاحبزادہ ساجد الرحمان صاحب اور سیرت چیئر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا ایک دفعہ پھر شکر گذار ہوں ۔اور آپ حضرات کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے ان بے ربط باتوں کو توجہ سے سنا۔اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

سوالات وجوابات

سوال

ہمارے ہاں آداب معاشرت کے حوالے سے عام طور پر ایک فکر پائی جاتی ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں کم صلاحیت اور حیثیت کی مالک ہے، جیسے وراثت میں بھی اس کا حصہ کم ہے وغیرہ۔ کیا یہ ایک اسلامی فکر ہے یا ہماری اپنی تشکیل کردہ فکر ہے؟

جواب

دیکھیں دو تین چیزیں ہیں یہاں الگ الگ۔ ایک تو ہے عورت اور مرد کی صلاحیتیں۔ تو وہ تو ظاہر ہے کہ ہر فرد کا الگ الگ معاملہ ہے۔ اس میں بحیثیت مجموعی کوئی بات کہنا مشکل ہے۔ باقی جہاں "ناقصات عقل[29]" کہا گیا ہے وہاں ایک خاص سیاق ہے جس کے تحت کہا گیا ہے۔ وہ کوئی عمومی حکم نہیں ہے۔ اور دوسرا معاملہ ہے حقوق کا یعنی میاں بیوی کے حقوق کا۔ تو اس میں لفظ ہم بعض اوقات مساوات کا بولتے ہیں۔ اس کی بجائے قرآن کی تعبیر "مماثلت" کی ہے۔ "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ"[30]۔ اس لیے اب متعین حوالہ تو میرے ذہن میں نہیں ہے لیکن متعدد محدثین اور فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی نص سے کسی ایک فریق کا کوئی حق ثابت ہو رہا ہے تو ہم یہ سمجھیں گے کہ دوسرے فریق کو بھی اسی نوعیت کا اس بدلے میں کوئی حق حاصل

---

29 سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب: فِتْنَةِ النِّسَاءِ

30 سورۃ البقرۃ، آیت نمبر 228

ہوگا۔ اگرچہ بیان صرف ایک کو کیا گیا ہو۔ مثلاً ازدواجی تعلق کے حوالے سے عام طور پر وہ حدیثیں روایت کی جاتی ہیں جن میں بیوی کی ذمہ داری بیان کی گئی ہے کہ وہ خاوند کی خواہش پورا کرنے سے انکار نہ کرے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس بھی نصوص موجود ہیں، اور فقہاء کی عبارات بھی موجود ہیں۔ جو یہ بتاتی ہیں کہ بنیادی طور پر یہ حق مماثلت پر مبنی ہے۔ اور تیسری چیز ہے جس کا آپ نے حوالہ دیا یعنی مالی حقوق۔ تو مالی حقوق کا تعلق کسی کے مرتبے اور مقام سے نہیں ہوتا بلکہ دیگر عوامل سے ہوتا ہے۔ ان میں ایک چیز ذمہ داری ہے۔ مرد پر چونکہ ذمہ داری زیادہ عائد کی گئی ہے۔ والدین اگر بوڑھے ہوجائیں تو ان کو سنبھالنے کی ذمہ داری بھی مرد پر عائد ہوگی۔ اگر کوئی بزرگ بے سہارا زندگی گذار رہے ہوں تو ان کی بیٹیوں کو کوئی طعن و تشنیع نہیں کرے گا، اس کے بیٹوں ہی کو طعن و تشنیع کرے گا۔ اسی طریقے سے اپنے بچوں کے اخراجات کی ذمہ داری بیٹوں پر تو ہے، بیٹیوں پر اپنے بچوں کے اخراجات کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس لیے وراثت میں دونوں کے حصوں کے اندر فرق کیا گیا ہے۔

سوال

ہمارے دینی مدارس کا جو نصاب ہے سر، اس کے اندر سیرت کا کتنا حصہ موجود ہے؟ کیونکہ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے وہاں اس چیز کی کمی پائی جاتی ہے۔

جواب

اگرچہ قرآن اور حدیث بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہی ہیں لیکن سیرت ایک مستقل فن بھی ہے تو اس حیثیت سے آنا چاہیے۔ البتہ اس وقت کوئی نہ کوئی مختصر کتاب سیرت کی تقریباً ہر مدرسے کے نصاب میں شامل ہوتی ہے، پڑھائی جاتی ہے۔ جیسے کئی مدارس میں مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ کی "سیرت خاتم الانبیاء" پڑھائی جاتی ہے، بعض جگہ شاید شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مختصر رسالہ بھی پڑھایا جاتا ہے۔ لیکن بہر حال اس میں مزید بہتری کی ضرورت ہے کہ سیرت بطور فن بھی ان کے تعارف میں آئے۔

سوال

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث ہے "انزلوا الناس منازلھم "[31] (یعنی لوگوں کے ساتھ ان کے مرتبے کے لحاظ سے معاملہ کرو) اور آپ نے جتنی مثالیں دیں ان میں بھی یہ واضح ہے۔ لیکن ہمارے ہاں عام طور پر معاشرے میں لوگ ایک لگے بندھے نظام پہ چل رہے ہیں۔ اور جب اس کو کسی اعتبار سے پریکٹس کرنے کی کوشش کی جائے تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے، یا اس کو غیر شرعی اور غیر دینی سمجھا جاتا ہے۔ تو اس طرح کے معاملات میں ہماری حکمت عملی کیا ہونی چاہیے؟

---

31 سنن ابی داود، کتاب الأدب، باب فی تنزیل الناس منازلھم

جواب

اس میں میرا خیال ہے کہ بنیادی وجہ یہ ہی ہے کہ سیرت کا وہ شعور پبلک کے لیول پر نہیں ہے۔اور وہی بات جو آخر میں میں نے کی، کہ ریسرچ پیپرز میں، کتابوں میں تو ہماری بہت اعلی تحقیقات موجود ہوتی ہیں لیکن سوسائٹی کی طرف منتقل کرنے کے طریقہ کار پر ہمارے ہاں ریسرچ بہت کم ہوتی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سیرت میں دیکھیں تو دوچیزیں الگ الگ ہیں۔ایک ہے "انزلوا الناس منازلهم"۔یہ بالکل الگ چیز ہے۔اور ایک ہے وی آئی پی کلچر۔یہ اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔اور مخرمہ جو کہہ رہے ہیں کہ "انہ لیس بجبار"۔وہ در حقیقت دوسری چیز کی نفی کرر ہے ہیں۔تو پہلی چیز کی حوصلہ افزائی اسلام نے کی ہے اور دوسری چیز کی حوصلہ شکنی کی ہے۔تواس پر بہر حال عوامی شعور کی کمی ہے۔اس پر ہمیں سوچنا چاہیے۔

سوال

واقعہ افک کا آپ نے ذکر کیا کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منصب کے تحت کیا جو کیا۔تو ایک ایسے ہی ذہن میں بات آئی کہ ایک شوہر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تسلی کیسے دی؟ یعنی اس میں اتنی تاخیر کیوں کی؟اور اسی کے حوالے سے ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ ہماری زندگی میں اگر مختلف رولز ہیں ،پوزیشنز ہیں تو کس وقت کس منصب کے تحت ہمیں عمل کرنا چاہیے؟

جواب

یہ سوال بہت اچھا ہے اور اس حدیث کو جب پڑھتے ہیں تو ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے۔ تو اسی لیے ایک تو میں نے پہلے یہ بات عرض کی تھی کہ یہ جتنا وقت گذرا ہے اس حالت میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی منصبی مجبوری کے تحت تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک وقت تک اس کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے اور اس کے بعد آپ اپنے طریقہ کار میں تبدیلی بھی چاہتے تھے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے پوچھنا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہت گراں تھا لیکن بظاہر یہ کسی نئے اقدام کی تمہید تھی۔ لیکن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اسی مجلس میں اللہ کی طرف سے وحی آگئی۔ اس لیے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ اور سوچنا نہیں پڑا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ایک مجبوری کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ انداز اختیار کرنا پڑا اور یقیناً حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کو اس کی وجہ سے کلفت بھی ہوئی۔ اور حدیث افک سے اس کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ جب کسی منصبی مجبوری کے تحت اگر اس طرح کی کوئی چیز ہو جاتی تھی تو بعض مواقع پر تو آپ صراحۃً معذرت کر لیا کرتے تھے۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ کہ آپ نے کسی کو محبوس رکھا کچھ دیر کے لیے لیکن بعد میں کوئی چیز ثابت نہیں ہوئی۔ ہمارے ہاں تو سالہا سال جیلوں میں پڑا رہے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معذرت کی۔ اور بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اخلاق سے اس کو compensate (مداوا، تلافی) کر دیا کرتے تھے۔ اب اس کے لیے کون سی چیزیں ہیں جن کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اذیت کو جو

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے برداشت کی ، کمپنسیٹ کیا ہوگا ،اس کی تفصیل میرے علم میں نہیں ہے۔

تبصرہ،ڈاکٹر طفیل ہاشمی

افک کے واقعے کے متعلق ایک تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ یہ واقعہ در حقیقت ایسا ہے کہ کوئی بھی مسلمان اپنے آپ میں رہ کر اسے پڑھ اور سن نہیں سکتا۔ یہ اس طرح کا واقعہ ہے۔ لیکن میں اسے ایک اور پہلو سے دیکھتا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کی پوری زندگی، پوری انسانیت کے لیے نمونہ ہے۔ فرض کیجیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ اس سے مختلف ہوتا۔ آپ شروع سے ہی یہ فرماتے کہ نہیں یہ سب جھوٹ ہے ،مجھے عائشہ پر اعتماد ہے ،مجھے فلاں پر اعتماد ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کے بعد آپ یہ دیکھیں کہ سب کچھ جب رپورٹ ہوتا تو ہمارے دور کے مستشرقین اور قدیم دور کے جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذرا ذرا سی بات کو لے کر رائی کا پہاڑ بناتے رہے، کیا وہ یہ نہ کہتے کہ آپ نے اپنے گھر کے بارے میں تو رویہ ایسا رکھا، کہ جب گھر پر بات آئی تو آپ نے ساری بات پر اس طرح مٹی ڈال دی اور کہیں کوئی تحقیق کی بات نہیں ہوئی۔ کہیں کچھ نہیں ہوا۔ اور میرا رجحان یہ ہے ،اس کے لیے میرے پاس دلیل تو نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلسل خاموشی در حقیقت اللہ کو اس بات پر آمادہ کرنا تھا کہ وہ خود فیصلہ کرے۔

تبصرہ، مولانا محمد زاہد

بہت اہم نکتہ ہے۔ اور اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہمیں یہ نہیں کرنا چاہیے کہ دوسروں پر الزام کے لیے تو ہر وقت تیار ہوں اور جب اپنے اوپر الزام ہو تو اس میں پہلے ہی مرحلے میں اپنے دفاع میں خود ہی کھڑے ہو جائیں۔

سوال

استاذ محترم! گفتگو میں بہت کچھ ایسا تھا جس سے سیکھنے کو ملا۔ جزاکم اللہ خیرا۔

سر سوال یہ ہے کہ آپ نے کہا کہ ہمیں یہ سوچ نہیں رکھنی چاہیے کہ جو مسئلہ بھی حل ہو گا وہ میرے وجود سے ہی حل ہو گا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایسی مثالیں بھی بہت ملتی ہیں۔ تو ہم اپنی عملی زندگی میں کیسے اس چیز کا تعین کر سکتے ہیں کہ کب ہمیں اپنے سے چھوٹوں کے کسی مسئلے میں انٹرفیئر کرنا چاہیے اور کب ہمیں دست بردار رہنا چاہیے؟

جواب

جہاں یہ محسوس ہو کہ ان کو ہماری ہیلپ کی ضرورت ہے۔ یعنی ہیلپ کا نقطہ نظر سامنے ہو۔ تو وہاں تو انٹرفیئر کرنا اچھی بات ہے۔ لیکن میں جس چیز کی بات کر رہا تھا وہ عام طور پر عدم اعتماد پر مبنی ہوتا ہے کہ ہم یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ میرے علاوہ کوئی اور یہ کام کر نہیں سکتا۔ تو موقع ضرور دینا چاہیے اپنے چھوٹوں کو اپنے معاملات خود حل کرنے

کا۔اور ایک وقت تک اس کو دیکھنا بھی چاہیے۔ لیکن جب محسوس کریں کہ اب شاید معاملہ اپنی لائن سے ہٹ جائے گا تو وہاں آپ انٹرفیئر کر سکتے ہیں۔ جیسے آپ کسی کو ڈرائیونگ سکھا رہے ہوتے ہیں تو آپ برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوتے ہیں تو آپ کے پاس بھی بریک ہوتی ہے۔اس گاڑی میں ڈبل بریک ہوتی ہے۔ تو اول تو آپ اسی کو دیکھتے ہیں کہ وہ چلائے اور وہی بریک بھی لگائے۔ لیکن جہاں آپ محسوس کرتے ہیں کہ نہیں اب مجھے ہی بریک لگانی چاہیے تو پھر آپ بھی بریک لگا دیتے ہیں۔ تو یہ سکھانے کا انداز ہونا چاہیے، مداخلت کا انداز نہیں ہونا چاہیے۔